ریاستِ خلافت میں
حکمرانی کی کمزوری کے اسباب

عثمان عادل

1439ہجری- 2018ء

ریاستِ خلافت میں حکمرانی کی کمزوری کے اسباب

یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اسلامی ریاستِ خلافت نہایت شاندار اور پُر شکوہ ریاست تھی جس کا نظامِ حکومت ایک مستحکم اور مؤثر نظام تھا۔ اگرچہ اسلامی ریاست نے اپنے ابتدائی دور میں ہی اس وقت کی دو سپر پاور زیعنی روم اور فارس کو مسخر کر لیا تھا جن کی اپنی تہذیب اور طرزِ حکمرانی تھا۔ مگر مسلمانوں نے حکومت کو چلانے اور ریاستی اداروں کو استوار کرنے کے لیے اس وقت کی اِن عظیم سلطنتوں میں رائج نظاموں کی طرف رجوع نہیں کیا اور نہ ہی انہیں اس کی کوئی ضرورت تھی کیونکہ نظام اور ریاستی ڈھانچے کے لیے ان کے پاس قرآن وسنت کی رہنمائی موجود تھی، ریاست کا ہر انسانی مسئلے کے لیے قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنا ہی اس ریاست کی مضبوطی کی بنیاد تھا۔

تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست میں حکمرانی کے مسائل نے جنم لیا اور حکمرانی کے مختلف بحران پیدا ہوئے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ حکمرانی رفتہ رفتہ کمزور ہوتی گئی، ریاستِ خلافت شکست وریخت کا شکار ہوئی، یہاں تک کہ اس کا انہدام ہو گیا۔

وہ کیا عوامل تھے کہ جو ریاستِ خلافت کی حکمرانی کو کمزور کرنے کا باعث بنے اور آج خلافت کے دوبارہ قیام کے بعد اس کی حکمرانی کو مستحکم رکھنے اور اسے کمزور ہونے سے بچانے کے لیے ریاستِ خلافت کی اس تاریخ میں ہمارے لیے کیا سبق ہے، اس کتابچے میں ہم اس بات کو جاننے کی کوشش کریں گے۔ یہاں مقصد خلافت کی کمزوری کے تمام تر عوامل اور ریاستِ خلافت کے انہدام کی تمام تر وجوہات کا احاطہ کرنا نہیں، بے شک یہ ایک وسیع موضوع ہے، یہاں ہمارا مقصد حکمرانی اور حکومتی نظام پر نظر ڈالنا ہے۔

اور ہم اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی کوشش بھی کریں گے کہ کیا خلافت میں جنم لینے والے اِن بحرانوں کی بنا پر کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں انسانی عقل اور تجربے سے حاصل ہونے والے نتائج سے استفادہ کرتے ہوئے ریاستِ خلافت کے ڈھانچوں اور حکمرانی سے متعلق قوانین میں تبدیلی کی جانی چاہئے۔ جیسا کہ خلافتِ

راشدہ کے بعد حکمرانی کے موروثی بن جانے اور نتیجتاً مسندِ خلافت کم اہلیت کے لوگوں کے ہاتھ میں چلے جانے کی بناپر کچھ لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ آج کے جمہوری سیٹ اَپ کی طرح خلیفہ کی مدتِ خلافت بھی چند سالوں تک محدود ہونی چاہئے، اور وہ اس رائے کو اجتہاد کا نام دیتے ہیں۔ تو اسلام میں ایسے 'اجتہاد' کی کس حد تک گنجائش ہے؟ کیا ماضی کے ریاستی ڈھانچے سے ہٹ کر آج کوئی نیا ریاستی ڈھانچہ تشکیل نہیں دیا جاسکتا؟ اگر نہیں، اور اسلام کے نظامِ حکمرانی کو من وعن نافذ کیا جانا چاہئے تو کیا آج یہ دوبارا انہی مسائل کو جنم نہیں دے گا کہ جن کا ماضی میں مشاہدہ ہو چکا ہے۔

ان سوالات کا درست جواب حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے ہم ان عوامل پر نظر ڈالتے ہیں کہ جن کی وجہ سے ماضی میں حکمرانی کمزوری سے دوچار ہوئی یا ریاستِ خلافت میں مختلف بحرانوں نے جنم لیا۔

1) ولایتِ عامہ اور والیوں کی خود مختاری

اسلام میں صوبوں کے والی یعنی گورنر دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک والیٔ عام اور دوسرا والیٔ خاص۔ والیٔ عام ایسا والی ہوتا ہے جو صوبے کے تمام حکومتی معاملات کا ذمہ دار ہوتا ہے اور خلیفہ اسے وسیع اختیارات کے ساتھ حکمران مقرر کرتا ہے، صوبے میں فوج، عدلیہ اور اموال اسی کے ماتحت ہوتے ہیں۔ جبکہ والیٔ خاص ایسا والی ہوتا ہے جسے کچھ شعبوں کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ خلیفہ کے لیے جائز ہے کہ صوبے پر ایک ہی والیٔ عام مقرر کرے اور تمام تر محکمے اس کے ماتحت ہوں یا ایک صوبے پر دو یا دو سے زیادہ والیٔ خاص مقرر کرے جن کا اپنا اپنا دائرہ اختیار ہو۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو صرف صوبے کے مالیاتی امور پر والی مقرر کیا جائے جبکہ حکمرانی کے باقی امور ایک اور والی کے تحت ہوں یا کسی والی کو مالیات، عدلیہ اور عسکری امور کے علاوہ دیگر معاملات کیلئے مقرر کیا جائے جبکہ یہ امور علیحدہ علیحدہ والیوں کے تحت ہوں۔

تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صوبوں پر والیٔ عام کی تقرری ریاست کی کمزوری کا باعث بن سکتی ہے۔ جیسا کہ حضرت امیر معاویہ کے معاملے میں ہوا۔ عثمانؓ کی شہادت کے بعد علیؓ کے دورِ خلافت میں جب امیر معاویہ نے علیؓ کی اتھارٹی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے خلاف بغاوت کر دی تو حکمرانی کے شدید بحران نے جنم لیا، جو جنگِ صفین کا موجب بنا۔ حکمرانی کے اس بحران کی وجہ سے اسلامی ریاست اندرونی مسائل میں اُلجھ گئی، ریاست کی توجہ خارجہ پالیسی سے ہٹ گئی اور جہاد کے ذریعے اسلامی ریاست کی سرحدوں کا پھیلاؤ تقریباً رُک گیا۔

امیر معاویہ علیؓ کی اتھارٹی کو چیلنج کرنے کے قابل اس وجہ سے ہوئے کہ انہیں شام کے صوبے میں ولایتِ عامہ حاصل تھی۔ امیر معاویہ کو عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں شام کے صوبے پر والی مقرر کیا تھا۔ شام اسلامی ریاست کا اہم صوبہ تھا جس کی سرحدیں رومی سلطنت سے لگتی تھیں اور یہاں پر ایک قابل اور مضبوط شخص کے تقرر کی ضرورت تھی جسے حکمرانی کے وسیع اختیارات حاصل ہوں تاکہ رومیوں کی طرف سے کسی بھی پیش قدمی کا فوری اور موثر جواب دیا جاسکے۔ عمرؓ نے حضرت امیر معاویہ کو اس ذمہ داری کے لیے چُنا۔ عمرؓ والیوں پر کڑی نظر رکھتے تھے اور ان کا سخت محاسبہ کرتے تھے اور ان کے سامنے کسی والی کو سر اٹھانے کی جرأت نہ تھی۔ عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب علیؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو انہوں نے اپنی حکمرانی کے ابتدائی ایام میں ہی بڑے پیمانے پر والیوں کو تبدیل کرنا شروع کیا جبکہ باغیوں کے ہاتھوں عثمانؓ کی شہادت کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کے باعث ان کی اپنی حکمرانی ابھی مستحکم نہیں ہوئی تھی۔ امیر معاویہ بھی تبدیل کیے جانے والے والیوں میں سے ایک تھے، تاہم امیر معاویہ نے نہ صرف اپنی معزولی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ شام کے صوبے میں اپنے اقتدار کو علیؓ کی خلافت کو چیلنج کرنے کا ذریعہ بنایا۔

پھر عباسی خلفاء کے دورِ زوال میں بھی ایسا ہی ہوا کہ جب صوبوں کے والیوں کو ولایتِ عامہ حاصل تھی تو صوبے خود مختار ہو گئے تھے اور ان پر خلیفہ کی اتھارٹی کم ہو کر محض اس قدر رہ گئی تھی کہ ان کے لیے جمعہ و عیدین کے خطبات میں دعا کی جائے اور جو سکے جاری کیے جائیں ان پر خلیفہ کا نام کندہ ہو۔

پس والی کو ولایتِ عامہ تفویض کرنا اسلامی ریاست کے لیے نقصان کا موجب بن سکتا ہے۔ لہٰذا والی کو محدود اختیارات کے ساتھ ولایتِ خاصہ تفویض کی جانی چاہیے جو اسے خلیفہ کی ماتحتی سے آزاد ہونے سے باز رکھے۔

جو چیز ایک صوبے کو ریاست سے جدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے وہ افواج، اموال اور عدلیہ کا والی کے ہاتھ میں ہونا ہے۔ کیونکہ افواج قوت کا ذریعہ ہیں، اموال کی حیثیت ایسے ہی ہے جیسے کہ جسم میں خون کی ہوتی ہے اور عدلیہ کے ذریعے حدود کا نفاذ اور حقوق کا تحفظ ہوتا ہے اور حکومتی قانون کی بالادستی قائم ہوتی ہے۔ ان تینوں امور کو والی کے ہاتھ میں دینا ولایہ کے ریاست سے جدا ہونے کو آسان بناتا ہے۔ پس حزب نے ریاستِ خلافت کے لیے تیار کردہ مسودۂ دستور کی دفعہ نمبر 54 میں اس بات کو صراحتاً بیان کیا ہے:

والی کو خلیفہ کے نائب ہونے کی وجہ سے اپنی ولایہ میں حکمرانی اور ولایہ کے محکموں کی نگرانی کا اختیار حاصل ہو گا۔اس کو اپنے ولایہ میں محکمہ مالیات، قضاء(عدلیہ)اور فوج کو چھوڑ کر باقی تمام محکموں کے اوپر تمام اختیارات حاصل ہوں گے۔

2) والیوں کا ایک ہی ولایہ پر طویل عرصے تک مامور رہنا

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ حکمرانی کا وہ بحران جس نے اسلامی ریاست کو ہلا کر رکھ دیا وہ حضرت امیر معاویہ کی قیادت میں شام کے اہم صوبے کی خلافت سے علیحدگی تھی۔اوپر ہم نے بیان کیا کہ کس طرح امیر معاویہ کو ولایتِ عامہ حاصل ہونا دراصل اس علیحدگی کا موجب بنا۔ وہ دوسری چیز جو اس میں مدد و معاون ثابت ہوئی وہ امیر معاویہ کا طویل عرصے تک شام کے والی کے طور پر برقرار رہنا تھا۔ امیر معاویہ عمرؓ کے دور میں والی بنے اور عثمانؓ کے پورے دورِ خلافت میں والی کے طور پر کام کرتے رہے۔یوں وہ تقریباً دو دہائیوں کے لیے صوبے کے حاکم تھے اور انہیں حکمرانی کے تمام تر اختیارات حاصل تھے۔اس طویل دورِ حکمرانی نے امیر معاویہ کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ صوبے میں اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کر لیں۔اس طویل دورِ اقتدار کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ بلادِ شام کے لوگ ان کی شخصیت سے منسلک ہو گئے اور ان کی وفاداری ریاست سے زیادہ امیر معاویہ کے ساتھ ہو گئی۔ چنانچہ جب انہوں نے علیؓ کے خلاف صف آرا ہونے کا فیصلہ کیا تو تمام صوبہ ان کے اس فیصلے کی پشت پر کھڑا تھا اور صوبے کے لوگوں نے آپ کا بھرپور ساتھ دیا۔

چنانچہ بہتر یہ ہے کہ کچھ سالوں کے بعد صوبے کے والی کو اس کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا جائے اور اس کی بجائے نیا والی مقرر کر دیا جائے۔اسی طرح اگر صوبے میں موجود لوگوں کی نمائندہ مجلسِ ولایہ کی اکثریت اپنے والی سے ناراضگی کا اظہار کرے تو خلیفہ والی کو برطرف کردے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بحرین میں اپنے والی علاء بن حضرمیؓ کو اس لئے معزول کر دیا تھا کیونکہ عبد قیس کے وفد نے علاء بن حضرمی کی شکایت کی تھی۔اس بنا پر حزب نے ریاستِ خلافت کے لیے تیار کردہ مسودۂ دستور میں بیان کیا ہے:

دفعہ نمبر 57: ایک ولایہ پر ایک ہی شخص کا طویل مدت تک والی رہنا مناسب نہیں۔خاص طور پر جب وہ کسی ولایہ میں مرکزی شخصیت بن جائے یا اس کی وجہ سے لوگوں کے فتنے میں پڑنے کا خطرہ ہو۔

اور

دفعہ نمبر 59: جب خلیفہ والی کو معزول کرنا مناسب سمجھے تو اسے معزول کر سکتا ہے۔ یا پھر مجلسِ امت اس پر عدم اعتماد کا اظہار کر دے، یا مجلس اس سے ناراضگی کا اظہار کرے، تو اسے معزول کیا جائے گا۔

3) ولی عہدی کا آغاز اور خلافت کا ایک ہی خاندان میں محدود ہو جانا

ولی عہدی کے بارے میں پہلے ہم یہ واضح کر دیں کہ اسلام میں ولی عہدی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یعنی کوئی شخص خلیفہ کے انتقال کے بعد محض اس بنیاد پر خود بخود خلیفہ قرار نہیں پاتا کہ سابق خلیفہ نے اسے اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا۔ خلفائے راشدین کے چناؤ کے سرسری جائزے سے بعض لوگ اس بارے میں تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ ابو بکرؓ نے بھی تو عمرؓ کو اپنے بعد خلیفہ مقرر کیا تھا اور پھر عمرؓ نے اپنی طرف سے چھ افراد کو نامزد کر دیا تھا اور تمام صحابہؓ اس پر خاموش رہے تھے اور ان کا یہ سکوت اس بات پر اجماع ہے کہ جانشین مقرر کرنا جائز ہے۔ تاہم یہ استدلال اس لیے درست نہیں کیونکہ ابو بکرؓ نے عمرؓ کو بذاتِ خود اپنے بعد خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا، بلکہ مسلمانوں نے ان سے تقاضا کیا کہ وہ کسی کو اپنی جگہ مقرر کر جائیں۔ امت کا یہ تقاضا دراصل امت کی طرف سے خلیفہ کے تقرر کا اختیار ابو بکرؓ کو سونپنا تھا کہ وہ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے امت کے نمائندے کے طور پر خلیفہ کے چناؤ کا کام سرانجام دیں۔ تو ابو بکرؓ نے لوگوں سے مشورہ کیا کہ وہ کسے خلیفہ بنانا چاہتے ہیں اور اسکے نتیجے میں ابو بکرؓ نے علیؓ اور عمرؓ کو نامزد کیا۔ اس کے بعد لوگوں نے ابو بکرؓ کی زندگی ہی میں تین ماہ کے دوران اکثریت کے ساتھ عمرؓ کو منتخب کر لیا۔ پھر لوگوں نے ابو بکرؓ کی وفات کے بعد عمرؓ کی بیعت کی، تب جا کر عمرؓ کی خلافت قائم ہوئی۔ بیعت سے پہلے عمرؓ خلیفہ نہیں تھے اور ابو بکرؓ کی نامزدگی اور مسلمانوں کے انتخاب سے خود بخود ان کی خلافت قائم نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ یہ خلافت اس وقت قائم ہوئی تھی جب مسلمانوں نے رضامندی و اختیار سے آپ کی بیعت کی تھی اور عمرؓ نے خلیفہ بننا قبول کیا تھا۔ اسی طرح عمرؓ نے اپنے زخمی ہونے کے بعد جن چھ افراد کو مقرر کیا تھا تو وہ بھی مسلمانوں کی درخواست پر کیا تھا۔ پھر علیؓ کو اس شرط پر خلیفہ منتخب کیا گیا کہ وہ حکمرانی کے معاملے میں ابو بکرؓ و عمرؓ کے اجتہاد پر کاربند رہیں گے، بصورتِ دیگر (یعنی اس شرط پر علیؓ کے انکار کی صورت میں) عثمانؓ خلیفہ بنیں گے۔ جب علیؓ نے ابو بکرؓ اور عمرؓ کے طریقے پر کاربند رہنے کی پابندی کو قبول کرنے سے معذرت کر لی تو عبد الرحمن بن عوفؓ نے (اسی شرط پر) عثمانؓ کی بیعت کر لی، چنانچہ دوسرے لوگوں نے بھی پھر ان کی بیعت کی۔ یوں عثمانؓ کی خلافت لوگوں کی بیعت سے قائم ہوئی، نہ کہ عمرؓ کی نامزدگی

سے،اور نہ محض لوگوں کے انتخاب سے۔اگرلوگ ان کی بیعت نہ کرتے یا عثمانؓ اسے قبول نہ کرتے تو ان کی خلافت بھی قائم نہ ہوتی۔چنانچہ خلیفہ کے لیے مسلمانوں کی بیعت ضروری ہے اور خلافت ولی عہد یا جانشین مقرر کرنے سے قائم نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ حکمرانی کا عقد(contract)ہے اور اس پر دیگر معاہدات کی طرح معاہدات سے متعلق شرعی احکامات کا اطلاق ہوتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں ولی عہدی کی رسم کو سب سے پہلے امیر معاویہ نے ایجاد کیا جب انہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اپنی زندگی میں ہی اس کے لیے امت سے بیعت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ تاہم امت نے ولی عہدی کے ذریعے خلیفہ کے تقرر کے عمل کی سخت مزاحمت کی،جیسا کہ تاریخ کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہے۔یزید کی جانشینی اور اس کے بعد امام حسینؓ کی شہادت نے اسلامی ریاست کو شدید دھچکا پہنچایا۔اس کے بعد خلافت کے تمام ادوار میں کوئی شخص بیعت کے بغیر محض جانشینی سے خلیفہ نہیں بنا تاہم سیاسی اثر ورسوخ رکھنے والے خاندانوں کی طرف سے خلافت کو ایک ہی خاندان میں محدود کرنے کی کوششیں جاری رہیں۔چنانچہ خلافت اموی پھر عباسی اور اس کے بعد عثمانی خاندان میں محدود رہی۔خلفاء خلافت کو اپنے خاندان میں ہی باقی رکھنے کے لیے اپنی زندگی میں اپنے ہی بیٹے،بھائی،یا کسی خاندان والے کو ولی عہد نامزد کردیتے تھے اور پھر خلیفہ کے انتقال کے بعد عوام اس کی بیعت کرلیتے تھے۔عوام صرف اُسی شخص کو بیعت دے سکتے تھے جسے خلیفہ نے نامزد کرکے ولی عہد بنا دیا ہوتا تھا،شاذ و نادر ہی کبھی عوام اس کے خلاف بیعت کرپائے۔اس صورتِ حال کا ردِ عمل یہ ہوا کہ عام لوگوں یا کسی سیاسی گروہ کے لیے خلافت کا منصب حاصل کرنے کا کوئی سیاسی راستہ نہ رہا نتیجتاً وہ اس منصب کے حصول کے لیے عسکری جدوجہد کی طرف مائل ہوئے۔چنانچہ اسلامی ریاست میں مختلف گروہ اٹھے اور انہوں نے اتھارٹی اور حکمرانی کو حاصل کرنے کے لیے عسکری ذرائع اپنائے۔عباسی کھڑے ہوئے اور انہوں نے فارس اور عراق پر قبضہ کرلیا تاکہ تمام ریاست پر حاوی ہونے کیلئے اِن علاقوں کو نقطۂ آغاز بنائیں اور حکومت کو خاندانِ بنو ہاشم میں لے آئیں۔ان کے بعد فاطمی آئے اور مصر کے صوبے پر قبضہ کر کے وہاں سے پوری ریاست پر نظریں جما لیں تاکہ وہ اپنے اسماعیلی افکار، جو خلافِ شریعت تھے،کی بنیاد پر حکمرانی کو قائم کر سکیں۔اس سیاسی کشمکش سے ایک طرف تو اسلامی ریاست کو جھٹکا لگا اور فتوحات کا سلسلہ کسی حد تک معطل ہوگیا اور ریاست اندرونی معاملات میں الجھ گئی، تودوسری جانب اس کے باعث اقتدار کا دوسرا مرکز وجود

میں آیا اور مسلمانوں کی ریاست تقسیم ہو گئی جبکہ مسلمانوں کیلئے یہ جائز ہی نہیں کہ اُن کے ایک سے زیادہ حکمران ہوں۔

اس طرح بیعت سے متعلق حکمِ شرعی کا غلط نفاذ مسلمانوں کو اپنی پسند کے شخص کو بیعت دینے کے حق سے محروم کرنے کا سبب بنا اور ریاست کی کمزوری کا باعث بنا۔ البتہ یہ کمزوری اُس دور میں ظاہر نہ ہوئی جب تک ریاست فی نفسہٖ مضبوط تھی، لیکن جب اُس کی طاقت کمزور پڑی تو اس کے اثرات بھی ظاہر ہو گئے۔ حزب نے اپنے مسودۂ دستور میں واضح کیا ہے:

دفعہ نمبر25: صرف وہی شخص خلیفہ ہو سکتا ہے جسے مسلمان منتخب کریں۔ کسی بھی شخص کو خلیفہ کے اختیارات اس وقت حاصل ہوں گے جب دوسرے شرعی عقود کی طرح اس کی بیعت کا عقد شرعی طور پر مکمل ہو جائے۔

اور

دفعہ نمبر26: ہر عاقل و بالغ مسلمان کو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لینے اور خلیفہ کی بیعت کرنے کا حق حاصل ہے۔

4) خلیفہ کے چناؤ کے لیے متعین اسلوب کی عدم موجودگی

جس چیز نے خلافت کو ایک ہی خاندان میں محدود کرنے میں مدد فراہم کی وہ یہ امر تھا کہ خلیفہ کے چناؤ کے لیے ایک واضح اور مخصوص اسلوب کا تعین نہیں کیا گیا کہ جس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہو جائے کہ امت کی اکثریت کی رائے کیا ہے، اور امت کس شخص کو خلیفہ کے منصب پر دیکھنا چاہتی ہے۔

اگرچہ شرع نے خلیفہ کے تقرر کے لیے متعین طریقہ کار دیا ہے جو بیعت کا طریقہ ہے مگر بیعت سے قبل یہ معلوم کرنا کہ لوگوں کی اکثریت کسے بیعت دینا چاہتی ہے اس کے لیے اسلوب (سٹائل) کا تعین درکار ہے تاکہ کوئی ابہام پیدا نہ ہو اور کوئی غلط ذرائع استعمال کر کے سیاسی صورتِ حال کو اپنے حق میں نہ کر سکے۔ خلفائے راشدین کے دور میں مسلمانوں کو ایک اسلوب متعین کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کیونکہ اس وقت اہلِ حل وعقد معلوم تھے کہ جن کی رائے سیاسی امور میں امت کی رائے کی نمائندگی کرتی تھی، یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا گروہ تھا، اور اس وقت مسلمان تقویٰ کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے، چناؤ صحابہ کے درمیان تھا اور وہ سب کے سب عادل تھے۔ پس ایسا ہوا کہ

چاروں خلفائے راشدین کے چناؤ کے لیے مختلف اسلوب اپنایا گیا البتہ خلیفہ کی تقرری کا طریقہ کار ایک ہی تھا یعنی بیعت کا طریقہ۔ چنانچہ ابو بکرؓ کی مرتبہ انصار اور مہاجرین سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ ان کی اکثریت کسے خلیفہ بنانا چاہتی ہے۔ انصار کی طرف سے سعد بن عبادہؓ امیدوار تھے جبکہ مہاجرین کی طرف سے عمرؓ اور ابو عبیدہ بن جراحؓ کا نام سامنے آیا مگر وہ ابو بکرؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ پھر بحث و مباحثے کے بعد ابو بکرؓ پر اتفاق ہوا اور وہیں ان کی بیعت کا انعقاد کیا گیا۔ عمرؓ کی مرتبہ امت نے چناؤ کا اختیار ابو بکرؓ کو سونپ دیا اور انہوں نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ رائے کس شخص کے حق میں سب سے زیادہ ہے، لوگوں سے مشورہ کیا۔ عثمانؓ کی مرتبہ عمرؓ نے چناؤ کو چھ لوگوں میں محدود کر دیا جو عشرہ مبشرہ تھے کہ وہ اپنے میں سے جسے چاہیں خلیفہ کے طور پر منتخب کریں اور پھر ان چھ لوگوں کے منتخب کردہ دو اصحاب میں سے ایک یعنی عثمانؓ کو مدینہ کے لوگوں نے بیعت دے کر خلیفہ بنایا۔ علیؓ کی مرتبہ ان کا مدمقابل کوئی نہیں تھا اور مدینہ و کوفہ کے لوگوں نے براہِ راست ان کی بیعت کی تھی۔ تو یہ وہ مختلف اسلوب تھے کہ جو اس بات کو معلوم کرنے کے لیے اختیار کیے گئے کہ لوگوں کی اکثریت کسے خلیفہ کے طور پر پسند کر رہی ہے۔

تاہم بعد میں سیاسی صورتِ حال میں تبدیلی آ گئی۔ سیاسی مرکز ایک سے زیادہ ہو گئے۔ علیؓ کے چناؤ کے وقت مدینہ کے علاوہ کوفہ بھی ایک سیاسی مرکز تھا۔ پھر حضرت امیر معاویہ کے دور میں شام بھی ایک سیاسی مرکز بن گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے تقویٰ کا وہ اعلیٰ معیار باقی نہ رہا جو کہ خلفائے راشدین کے دور میں تھا۔ چنانچہ بعد کے ادوار میں ایسا ہوا کہ خلافت کو ایک ہی خاندان میں محدود کرنے کی کوشش کی گئی جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، اور لوگوں کی رائے اُس کھلے اور واضح طریقہ سے معلوم نہیں کی گئی کہ جیسے اس کا حق ہے۔ خلیفہ کے چناؤ کا ایک جامع اسلوب متعین نہ کرنا اس کی بنیادی وجہ تھا۔ چنانچہ ماضی سے سبق حاصل کرتے ہوئے آج ضروری ہے کہ خلیفہ کی تقرری کے عمل کے دوران خلافت کے مسلمان شہریوں کی رائے معلوم کرنے کے لیے ایک خاص اسلوب متعین کر دیا جائے تاکہ کسی قسم کا ابہام نہ ہو اور نہ ہی کوئی اسلوب کے عدم تعین کی وجہ سے اپنے لیے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔

حزب نے اس مسئلے پر گہری تدریس کی، خلفائے راشدین کے چناؤ کے لیے اختیار کردہ مختلف اسالیب کا جائزہ لیا، اور اس بات کا بھی جائزہ لیا کہ شرعی احکامات کی روشنی میں خلیفہ کی تقرری کے عمل میں ریاستِ خلافت کے مختلف اداروں کا کردار کیا ہو گا اور پھر اپنے مسودۂ دستور میں خلیفہ کے چناؤ کے لیے مندرجہ ذیل اسلوب اختیار کیا:

دفعہ نمبر33: (نئے خلیفہ کے تقرر کے سلسلے میں)عبوری امیر کا تقرر کیا جائے گا جو کہ مسلمانوں کے امور کی دیکھ بھال کرے اور منصبِ خلافت کے خالی ہونے کے بعد نئے خلیفہ کے تقرر کے عمل کا آغاز کرے، جو کہ یہ ہو گا:

۱) سابق خلیفہ جب یہ محسوس کرے کہ اس کی موت کا وقت قریب ہے یا وہ استعفیٰ دینا چاہتا ہو، تو اس صورت میں اسے حق حاصل ہے کہ وہ عبوری امیر کا تقرر کرے۔

ب) اگر عبوری امیر کے تقرر سے قبل خلیفہ کا انتقال ہو جائے یا وہ استعفیٰ دے دے یا خلیفہ کے انتقال یا استعفیٰ کے علاوہ کسی اور وجہ سے منصبِ خلافت خالی ہو جائے تو وہ معاون جو معاونین میں سب سے عمر رسیدہ ہو گا، وہ عبوری امیر ہو گا۔ ماسوائے یہ کہ وہ معاون بذاتِ خود خلافت کا امیدوار ہو۔ ایسی صورت میں وہ معاون عبوری امیر ہو گا جو عمر میں اس سے کم ہو، علیٰ ھذا القیاس۔

ج) اگر تمام تر معاون خلافت کے امیدوار ہوں، تو پھر وزراء تنفیذ میں سے سب سے عمر رسیدہ معاون عبوری امیر ہو گا، علیٰ ھذا القیاس۔

د) اگر تمام تر وزراء تنفیذ خلافت کے امیدوار ہوں، تو وزراء تنفیذ میں سے سب سے کم عمر وزیر ہی عبوری امیر ہو گا۔

ھ) عبوری امیر کو احکامات کی تبنی کا اختیار حاصل نہیں ہو گا۔

و) عبوری امیر اپنی پوری کوشش صرف کرے گا کہ وہ خلیفہ کے تقرر کے عمل کو تین دن کے اندر اندر مکمل کرے۔ اس مدت میں توسیع کی اجازت نہیں، ماسوائے یہ کہ محکمۂ مظالم کسی شدید سبب کی بنا پر اس مدت میں توسیع کر دے۔

اور

دفعہ نمبر34: خلیفہ کے تقرر کا طریقہ بیعت ہے۔ خلیفہ کے تقرر اور اسے بیعت دینے کا عملی طریقہ یہ ہے:

۱) محکمۂ مظالم منصبِ خلافت کے خالی ہونے کا اعلان کرے گا۔

ب) عبوری امیر اپنی ذمہ داری سنبھالے گا اور فوری طور پر نامزدگیوں کے کھل جانے کا اعلان کرے گا۔

ج) وہ درخواستیں قبول کی جائیں گی جو کہ انعقادِ خلافت کی شرائط پر پوری اترتی ہوں۔ اس کے علاوہ پیش کی جانے والی درخواستیں محکمۂ مظالم کے فیصلے کی بنا پر مسترد کر دی جائیں گی۔

د) وہ امیدوار جن کی درخواستوں کو محکمۂ مظالم نے قبول کیا، مجلسِ امت کے مسلمان اراکین ان امیدواروں کی فہرست کو دو مرتبہ مختصر کریں گے۔ پہلے اختصار میں وہ اکثریتی ووٹوں کی بنیاد پر چھ لوگوں کا انتخاب کریں گے۔ دوسرے اختصار میں وہ اکثریتی ووٹوں کی بنیاد پر دو امیدواروں کا انتخاب کریں گے۔

ھ) ان دو امیدواروں کے ناموں کا اعلان کیا جائے گا اور مسلمانوں کو ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔

و) انتخاب کے نتیجے کا اعلان کیا جائے گا اور لوگوں کو آگاہ کیا جائے گا کہ دونوں میں سے کسے زیادہ لوگوں کے ووٹ حاصل ہوئے۔

ز) وہ شخص جسے زیادہ ووٹ حاصل ہوئے، مسلمان اسے قرآن وسنت پر عمل پر بیعت دیں گے۔

ح) بیعت کے مکمل ہونے کے بعد عوام الناس کے لیے اس بات کا اعلان کیا جائے گا کہ کون مسلمانوں کا خلیفہ ہے یہاں تک کہ یہ خبر پوری امتِ مسلمہ تک پہنچ جائے۔ اور اس خبر میں خلیفہ کے نام کا اور ان شرائط کا اعلان کیا جائے گا جنہوں نے اُسے اس بات کا اہل بنایا کہ اس کی خلافت کا انعقاد کیا گیا۔

ط) نئے خلیفہ کی تنصیب کے عمل کے مکمل ہونے کے بعد عبوری امیر کی اتھارٹی اختتام کو پہنچے گی۔

عبوری امیر کی تقرری عمرؓ کے اختیار کردہ اسلوب کی روشنی میں ہے کہ جب وہ زخمی ہوئے اور اگلے خلیفہ کے تقرر کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ڈالی گئی، تو آپؓ نے ہدایت جاری کی کہ ان کے وصال کے بعد نئے خلیفہ کے تقرر تک صہیبؓ مسلمانوں کے امیر ہوں گے۔ عمرؓ نے چھ نامزدگان سے فرمایا تھا: "اور اِن دنوں جب تم لوگ مشورے میں ہوگے، صہیب تمہاری امامت کریں گے"۔ پھر آپؓ نے صہیبؓ سے فرمایا: "تم لوگوں کی تین دن تک نماز میں امامت کرنا" اور فرمایا: "اگر پانچ افراد ایک شخص پر متفق ہوجائیں اور چھٹا انکار کرے، تو تلوار سے اس کا سر اڑا دو..." یعنی صہیبؓ کو لوگوں پر امیر بنایا گیا اور اُنہیں صلاۃ کا امیر بنایا گیا، اس وقت امارتِ صلاۃ کے معنی لوگوں کی امارت کے تھے، پھر مزید یہ کہ اُنہیں عقوبات (سزاؤں) کے نفاذ اختیار دیا گیا تھا اور عمرؓ نے یہ کہا تھا کہ "اُس کا سر اُڑا دو"، اور قتل کی سزا کا نفاذ ایک حکمران ہی کر سکتا ہے۔ یہ واقعہ تمام صحابہؓ کی جماعت کے سامنے ہوا اور کسی نے اس سے انکار نہیں کیا، لہٰذا یہ صحابہؓ کا اجماع ٹھہرا کہ خلیفہ کسی شخص کو عبوری امیر مقرر کرے جو اگلے خلیفہ کی تقرری تک کی کارروائی کا نگران ہو۔

امیدواروں کی تعداد کی حد بندی بھی خلفائے راشدین کی تقرری کی بناپر ہے، خلفائے راشدین کی تقرری کی کیفیت پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہاں امیدواروں کی تعداد کی حد بندی کی گئی تھی۔ لہٰذا سقیفہ بنی ساعدہ میں ابو بکرؓ، عمرؓ، ابوعبیدہؓ اور سعد بن عبادہؓ ہی امیدوار تھے۔ لیکن چونکہ عمرؓ اور ابوعبیدہؓ خلافت کے مسئلے میں اپنے آپ کو ابو بکرؓ کے برابر نہیں سمجھتے تھے لہٰذا اُنہوں نے مقابلہ آرائی نہیں کی اور یوں عملاً صرف ابو بکرؓ اور سعد بن عبادہؓ ہی امیدوار رہ گئے۔ پھر سقیفۂ بنی ساعدہ میں اہلِ حل وعقد نے ابو بکرؓ سے بیعتِ انعقاد کی۔

اسی طرح عمرؓ نے خلافت کے معاملے کو چھ اشخاص میں محدود کیا جن میں سے ایک کو خلیفہ منتخب کیا جانا تھا۔ آپؓ نے لوگوں سے کہا: "تمہارے پاس وہ گروہ موجود ہے جن سے اللہ کے رسول ﷺ اپنی رحلت سے قبل راضی تھے اور ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ اہلِ جنت میں سے ہیں: علی بن ابی طالب، عثمان بن عفان، سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمن بن عوف، زبیر بن عوام اور طلحہ بن عبیداللہ۔ عبداللہ بن عمرؓ کو ان کے ساتھ کر دو لیکن وہ صرف اپنی رائے دے سکتے ہیں اور خلافت کے معاملے میں ان کا کوئی حصہ نہیں"۔

پھر عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے باقی پانچ افراد سے مشاورت کی اور ان کی طرف سے وکیل بنائے جانے کے بعد اس معاملے کو دو لوگوں میں محدود کیا یعنی علیؓ اور عثمانؓ میں۔

جہاں تک امیدواروں کی تحدید (شارٹ لسٹنگ) کو مجلسِ امت کے ذریعہ سرانجام دینے کا تعلق ہے تو یہ اس بناپر ہے کہ مجلسِ امت، امت کی نمائندگی کرتی ہے، کیونکہ یہ امت ہی ہے کہ جس نے عمرؓ کو خلیفہ کے چناؤ کا اختیار دیا اور انہوں نے چھ افراد کو نامزد کیا، پھر اِن چھ اشخاص نے اپنے میں سے عبدالرحمن بن عوفؓ کو وکیل بنایا، جنہوں نے مشاورت کے بعد اس معاملے کو دو میں محدود کر دیا۔ پس اِن تمام مراحل میں امت ہی اپنے نمائندوں کے ذریعے اختیار کی حامل ہے۔

اسی طرح خلیفہ کے چناؤ میں تمام امتِ مسلمہ کے براہِ راست ووٹ کی بجائے اس معاملے کو مجلسِ امت کے کے ذریعے سرانجام دینا بھی خلفائے راشدین کے اختیار کردہ اسلوب کی بناپر ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ابو بکرؓ کی بیعت میں مدینہ کے مسلمانوں میں سے صرف اہلِ حل وعقد پر اکتفا کیا گیا۔ اہلِ مکہ اور باقی جزیرہ نما عرب

کے مسلمانوں کی رائے نہیں لی گئی۔ عمرؓ کی بیعت میں بھی یہی ہوا۔ عثمانؓ کی بیعت میں عبد الرحمن بن عوفؓ نے صرف مدینہ کے مسلمانوں کی رائے لی۔ یہ سب، یعنی باقی تمام علاقوں کو چھوڑ کر صرف دار الخلافہ کے لوگوں کی بیعت سے خلیفہ کا انتخاب صحابہؓ کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ اور صحابہؓ نے اہلِ مدینہ کی اکثریت تک اس 'بیعتِ انعقاد' کو محدود کرنے کا نہ تو انکار کیا اور نہ ہی اس کی مخالفت کی۔ چنانچہ صحابہؓ کا اجماع تھا کہ حکومت کے معاملے میں مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والوں کی بیعت کے ذریعے خلافت قائم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اہلِ حل وعقد اور اہلِ مدینہ کی اکثریت ہی حکومت کے معاملے میں اس وقت اسلامی ریاست میں اکثریتی رائے کی نمائندگی کر رہی تھی۔

5) سیاسی جماعتوں کی عدم موجودگی

اسلام کے نفاذ، اسلام کی دعوت کو پہنچانے، نیز اسلام کے مسلسل اور بطریقِ احسن نفاذ کی طبعی ضمانت حکمران کا متقی ہونا ہے کیونکہ اللہ کا خوف حکمران کو اسلام سے متعلق اس کی اپنی ذات اور ضروریات سے زیادہ فکر مند بنا دیتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی حکمران کا دل تقویٰ سے خالی ہو جائے لہٰذا ایسے مادی ذریعہ کا ہونا ضروری ہے جو اسے اسلام کے نفاذ پر کاربند رکھے اور جسے یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ اس کی جگہ ایسا حکمران مقرر کر سکے، جو اسلام کو نافذ کرے اور اسلام کی دعوت کی ذمہ داری اٹھائے۔ یہ عملی ذریعہ امتِ مسلمہ ہے۔ امتِ مسلمہ پر فرض ہے کہ اگر وہ یہ دیکھے کہ حکمران اسلام کے نفاذ میں کوتاہی برت رہا ہے یا اسلام کے احکامات سے رُوگردانی کر رہا ہے یا اسلام کے نظاموں کو غلط انداز میں نافذ کر رہا ہے تو وہ حکمران کا محاسبہ کرے۔

تاہم اس کام کے لیے امت کے اندر سیاسی جماعتوں کا وجود ہونا ضروری ہے۔ سیاسی جماعتوں کی موجودگی کے بغیر امت کے لیے ریاست کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنا اور ریاست کا محاسبہ کرنا محال ہے۔ ایک فرد یا کچھ غیر مربوط افراد اس کام کو مؤثر انداز میں سرانجام نہیں دے سکتے اور نہ ہی وہ امت کی سیاسی تربیت کر سکتے ہیں اور اسے فکری طور پر بلند رکھ سکتے ہیں۔ اگر اسلامی ریاست میں شفاف اور بلند افکار پر مبنی ایک یا ایک سے زیادہ سیاسی جماعتیں موجود نہیں ہوں گی تو رفتہ رفتہ حکمرانی میں کمزوری پیدا ہوتی جائے گی خواہ حکمران عادل ہی کیوں نہ ہو۔ جبکہ اگر حکمران

عادل نہ ہو اور اسلام کے قوانین کا غلط نفاذ کرے یا اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتے تو امت میں سیاسی جماعتوں کی موجودگی حکمرانی کو واپس درست حالت پر لے آئے گی۔

اسلامی ریاست کی تاریخ اس کی واضح دلیل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں اپنی دعوت کے آغاز کے بعد ارقم بن ابو الارقمؓ کے گھر میں اسلامی افکار کے ذریعے اسلام قبول کرنے والے افراد کی شخصیت سازی اور تربیت کی اور ایک منظم گروہ تشکیل دیا۔ اس گروہ نے عملی طور پر اسلام کا علمبردار بننے کی ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ پھر مدینہ ہجرت کے بعد شخصیت سازی اور افراد سازی کا یہ عمل جاری رہا۔ یہاں تک کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ نے اپنے پیچھے ساٹھ ہزار صحابہؓ کی جماعت چھوڑی۔ یہ صحابہؓ ایک اسلامی گروہ یا جماعت تھے، جو باقی مسلمانوں سے ممتاز تھے اور جنہوں نے عملی طور پر اسلام کی ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر اٹھایا تھا۔ صحابہؓ نے آگے مزید مسلمانوں کی تربیت کی اور یوں تابعین اور تبع تابعین کا گروہ وجود میں آیا۔

لیکن جب صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین کا دور ختم ہوا تو امت کے اندر سے ایک ایسے گروہ کا خاتمہ ہو گیا جو اپنی فکر میں شفاف تھا اور عملی معاملات میں امت کی قیادت کر رہا تھا اور حکمرانوں کے اعمال پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ پس جب بعد کے ادوار میں اسلام کے احکامات کے نفاذ میں کوتاہی ہوئی تو ان کی بروقت نشاندہی کر کے اس پر مؤثر انداز میں حکمرانوں کا محاسبہ کرنے والا کوئی منظم گروہ موجود نہ تھا۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ بیعت کے حکم کو غلط طور پر نافذ کیا گیا اور خلافت کو چند خاندانوں تک محدود کر دیا گیا جیسا کہ امویوں نے کیا، اور ایسا ہوا کہ جہاد کے ذریعے اسلام کی دعوت کو دنیا تک پہنچانے میں سستی برتی گئی اور جہاد کے لیے محض رسمی طور پر موسمِ سرما اور موسمِ گرما میں ایک مہم بھیج دی جاتی جیسا کہ عباسیوں نے کیا، اسی طرح عباسی دورِ خلافت میں سپین پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا اور عباسی خلافت نے عیسائیوں کے اس اقدام کے خلاف حرکت میں آنے میں سستی برتی، عباسی دور میں مرکز کی اتھارٹی انتہائی کمزور ہو گئی اور صوبے خود مختار ہو گئے، جبکہ عثمانیوں نے خلافت کی وحدت اور جہاد کو دوبارہ رائج کرنے کو بہت اہمیت دی مگر امت کی اسلام کی سمجھ میں جو کمزوری آ گئی تھی اسے دور کرنے پر توجہ نہ دی، نہ ہی انہوں نے امت کی فکری کمزوری کو دور کرنے کے لیے عربی زبان کو رائج کرنے اور اسے ریاستی سطح پر اپنانے پر توجہ دی، جی ہاں! اسلامی ریاست میں یہ سب کچھ ہوا مگر اس پر حکمرانوں کو نصیحت کرنے، ان کا محاسبہ کرنے، امت میں اسلام کی گہری سمجھ کو پھیلانے اور اسلام کا علمبردار بننے کے لیے امت کی رہنمائی و قیادت کرنے والا کوئی سیاسی گروہ امت میں موجود نہ تھا۔ جس کی وجہ سے اسلامی ریاست کے زوال کو بروقت روکا نہ جا سکا۔ اس لیے یہ امر انتہائی ناگزیر ہے کہ آج خلافت علی منہاجِ نبوت کے قیام کے بعد اس میں ایک یا ایک سے زیادہ اعلیٰ افکار کی

حامل سیاسی جماعتیں موجود ہوں جو ریاستِ خلافت کی ترقی و عروج کو مستقل طور پر یقینی بنائے رکھیں۔ چنانچہ حزب نے اپنے مسودہ دستور میں اس بات کی صراحتاً وضاحت کی ہے:

دفعہ نمبر 21: حکام کے محاسبے یا امت کے ذریعے حکومت تک پہنچنے کے لیے مسلمانوں کو سیاسی پارٹیاں بنانے کی اجازت ہے، بشرطیکہ یہ پارٹیاں اسلامی عقیدے کی بنیاد پر ہوں اور جن احکامات کی ان پارٹیوں نے تبنی کی ہو، وہ شرعی احکامات ہوں۔ پارٹی بنانے کے لیے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ غیر اسلامی بنیاد پر ہر قسم کی پارٹی سازی ممنوع ہوگی۔

6) مجلسِ امت کا معدوم ہونا

رسول اللہ ﷺ صحابہ کرامؓ کے ساتھ معاملات میں کثرت سے مشورہ فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کا کثرت سے مشورہ کرنا اور اس کا اہتمام کرنا اس کی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔ ترمذی نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا کہ انہوں نے بیان کیا: ((ما رأيت أحداً أكثر مشورة لأصحابه من رسول الله)) "میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتا ہو"۔ آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں شوریٰ کا بھرپور اہتمام کیا۔ ابو بکرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں مہاجرین اور انصار میں سے کچھ لوگوں کو مخصوص کیا ہوا تھا اور جب بھی کوئی واقعہ رونما ہوتا تھا تو آپؓ مشورے کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ گویا یہ ایک مجلس تھی کہ جس کی طرف ابو بکرؓ حکمرانی کے معاملات میں مشورے کے لیے رجوع کیا کرتے تھے جس کے اراکین اہلِ شوریٰ علما اور اہلِ فتویٰ صحابہ تھے اور وہ آپؓ کے ارد گرد ہوا کرتے تھے۔ تاہم خلفائے راشدین کے بعد شوریٰ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ خاص طور پر جب حکمرانی ایک ہی خاندان میں محدود ہو گئی تو حکمران امت سے دور ہو گئے اور حکمرانی کے معاملات میں امت کا عمل دخل محدود ہو گیا۔ حکمران اور عوام میں دوری لازمی طور پر حکمرانی کو کمزور کرنے کا باعث بنتی ہے۔ ایک حکمران تبھی لوگوں کے امور کی احسن طریقے سے دیکھ بھال کر سکتا ہے جب وہ عوام کی صورت حال سے بخوبی واقف ہو، جس کے لیے ضروری ہے کہ عوام اور حکمران میں کوئی فاصلہ موجود نہ ہو۔ اور حکمران کمزور فیصلوں سے اسی وقت بچ سکتا ہے جب اسے امت میں سے باخبر اور سیاسی لحاظ سے بیدار لوگوں کا ساتھ حاصل ہو جو اسے حکمرانی کے مختلف امور پر مشورہ دیں، کسی بھی غلط اقدام اور فیصلے پر اس کا محاسبہ کریں اور حکمران تک اپنی رائے کو پہنچاتے رہیں۔ نیز ریاستِ خلافت اسلام کی دعوت کی

علمبردار اسی وقت بن سکتی ہے جب امت اسلام کی بنیاد پر سیاست کو سرانجام دینے میں سرگرمِ عمل ہو اور ریاستی معاملات سے لاتعلق نہ ہو۔ امت یہ سب کام اپنے نمائندوں کے ذریعے ہی مؤثر انداز میں کر سکتی ہے جو ایک مستقل مجلس کی صورت میں خلیفہ کے ارد گرد موجود ہوں۔ اور اسی طرح صوبائی سطح پر والیوں کی معاونت کے لیے صوبے کے لوگوں کی نمائندہ مجلس تشکیل دی جائے۔ پس حزب نے ریاستِ خلافت کے لیے اپنے تیار کردہ مسودۂ دستور میں یہ طے کیا ہے:

دفعہ نمبر105: ہر عاقل و بالغ شخص، جو ریاست کا شہری ہو، کو مجلسِ امت کا رکن بننے کا حق حاصل ہوگا۔ خواہ مرد ہو یا عورت، مسلمان ہو یا کافر، البتہ غیر مسلم رکن کا مشورہ حکام کے مظالم یا ان پر اسلامی احکامات کی غلط طریقے سے تنفیذ کی شکایت تک محدود ہوگا۔

اور

دفعہ نمبر111، شق 3: مجلسِ امت کو تمام معاملات میں ریاست کے محاسبے کا حق حاصل ہوگا۔ خواہ ان کا تعلق خارجہ امور سے ہو یا یہ داخلی امور ہوں یا یہ مالیات، فوج یا دیگر امور سے متعلق ہوں۔

نیز

دفعہ نمبر106: ہر ولایہ میں رہنے والے لوگ اپنی مجلسِ ولایہ کے اراکین کا چناؤ براہِ راست انتخاب کے ذریعے کریں گے۔ ولایات کی مجالس کے ممبران کی تعداد ولایہ میں رہنے والے لوگوں کی تعداد کی بنا پر ہوگی۔ مجلسِ اُمت کے ممبران کا چناؤ ان مجالسِ ولایات سے براہِ راست کیا جائے گا۔

اس بات کی دلیل کہ مجلسِ امت کے اراکین منتخب کیے جاتے ہیں اور وہ مقرر کردہ نہیں ہوتے، یہ ہے کہ مجلس امت کے اراکین لوگوں کی رائے کی وکالت کرتے ہیں اور وکیل کا انتخاب ان لوگوں کو کرنا چاہیے جن کی وہ وکالت کرتا ہو نہ کہ وکیل کو موکل پر مسلط کیا جائے۔ مجلسِ امت کے اراکین انفرادی اور اجتماعی طور پر لوگوں کی رائے کی نمائندگی کرتے ہیں اور ایک بڑے علاقے میں لوگوں اور لاتعداد افراد کی رائے معلوم کرنا ان کی طرف سے اپنے نمائندوں کے انتخاب کے بغیر ممکن نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مشورہ کے لیے لوگوں کا انتخاب ان کی قابلیت، استعداد اور شخصیت کی بنیاد پر نہیں کیا تھا بلکہ آپ ﷺ نے دو بنیادوں پر انہیں منتخب کیا تھا:

اول: وہ اپنے قبیلوں کے سردار تھے،اس بات سے قطع نظر کہ ان کی قابلیت اوراستعداد کیا تھی۔
دوم : وہ مہاجرین اورانصار کی نمائندگی کرتے تھے۔

اہلِ شوریٰ کے وجود کی وجہ لوگوں کی نمائندگی ہے۔ لہٰذا مجلس امت کے اراکین کے انتخاب کی بنیاد لوگوں کی نمائندگی ہونا چاہیے۔جیسا کہ انصار اور مہاجرین کے نمائندگان کے چناؤ کے موقع پر کیا گیا۔

لاتعداد افراد اور گروہوں کی نمائندگی انتخابات کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا مجلسِ امت کے اراکین منتخب کردہ ہی ہونے چاہئیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود ان لوگوں کا انتخاب کیا جن سے وہ مشورہ کیا کرتے تھے، یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ جگہ جہاں پر مہاجرین اور انصار بستے تھے یعنی مدینہ طیبہ،وہ ایک چھوٹا سا علاقہ تھا اوریہ کہ آپ ﷺ مسلمانوں سےواقف تھے۔ اس کے برخلاف بیعتِ عقبہ ثانیہ میں جن مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کوبیعت دی،آپ ﷺ انہیں نہیں جانتےتھے، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے لوگوں میں سے سردار چننے کا معاملہ ان پر چھوڑ دیا اور کہا: ((أخرجوا لیَّ منکم اثنی عشر نقیباً لیکونوا علی قومہم بما فیہم)) "اپنے میں سے بارہ سردارمنتخب کروجواپنےاوراپنےلوگوں کےذمہ دارہوں" (اسے ابنِ ہشام نےکعب بن مالکؓ سے روایت کیا)۔

پس ثابت یہ ہوا کہ مجلسِ امت کے اراکین لوگوں کی رائے کی نمائندگی کرتے ہیں اور وہ شرعی علت (وجہ) کہ جس کی بناء پر مجلسِ امت قائم کی جاتی ہے،یہ ہے کہ مجلس رائے کو بیان کرنے اور حکمرانوں کا محاسبہ کرنے میں افرادوگروہوں کی نمائندگی کرے۔ اور اگر یہ لوگ نامعلوم ہوں تو یہ علت پوری نہیں ہوتی، جب تک کہ عام انتخابات نہ کرائے جائیں۔اس سے یہ ثابت ہوا کہ مجلسِ امت کے اراکین منتخب کردہ ہونے چاہئیں اور یہ مقررکردہ نہیں ہوسکتے۔

7) محکمۂ مظالم کا حکمران کے ہاتھ میں ہونا

لوگوں کے امور کی دیکھ بھال اور تنازعات کا فیصلہ کرنا بنیادی طور پر حکمران کی ذمہ داری ہے۔ رسول اللہ ﷺ بطورِ حکمران مدینہ میں لوگوں کے درمیان خود فیصلے فرمایا کرتے تھے اور آپ ﷺ نے لوگوں کے درمیان

فیصلہ کرنے کے لیے قاضی بھی مقرر فرمائے جیسا کہ آپ ﷺ نے علیؓ کو یمن میں قاضی بنا کر بھیجا۔ عدلیہ کے ضمن میں مظالم کے امور بھی داخل ہیں جو کہ حکام کے خلاف شکایتوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ قضاء کا اختیار حاصل ہونے کے سبب خلافت میں حکمران بذاتِ خود مظالم پر مبنی شکایات کی سماعت کیا کرتے تھے۔ اور یہ اسلام کی رُو سے غلط نہیں تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین نے اسی بات کو اختیار کیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کا دورِ خلافت عدل و انصاف کے لحاظ سے بے مثال تھا۔ قاضی فیصلہ کرنے میں ہر قسم کے دباؤ سے آزاد تھے اور حکمران بھی عادلانہ فیصلے کیا کرتے تھے خواہ یہ فیصلہ ان کے قریبی رشتہ دار، خاندان کے کسی فرد یا دوست یا خود ان کے اپنے خلاف ہی ہو۔ البتہ بعض موقعوں پر ایسا ہوا کہ جب کچھ حکمرانوں نے ظلم کیا تو اس کا سدِ باب نہ ہو سکا۔ اگر حکمرانوں کے ظلم کے ازالے کے لیے علیحدہ محکمہ تشکیل دے دیا جاتا جسے شرعی وجوہات کی بنا پر خلیفہ سمیت کسی بھی حکمران کو ہٹانے کا اختیار حاصل ہوتا تو اس بات کا زیادہ امکان تھا کہ یہ حکمران ظلم کرنے اور رعایا کے حقوق غصب کرنے سے باز رہتے۔ علاوہ ازیں یہ امر ناممکنات میں سے نہیں کہ خلیفہ یا والی کا دل تقویٰ سے خالی ہو جائے اور وہ اسلام کے نفاذ میں کوتاہی کرے یا اقتدار کو اپنے یا اپنے منظورِ نظر افراد کے ذاتی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرے یا خلافت کے شہریوں کے مال میں یا عوامی ملکیت میں ناحق تصرف کرے، یا لوگوں کو سزا دینے میں حد سے تجاوز کرے۔ چنانچہ آج ایسی کسی بھی صورتِ حال کی روک تھام کو مؤثر بنانے کے لیے بہتر یہ ہے کہ مظالم کی دادرسی کو مستقل طور پر علیحدہ محکمے کی شکل دے دی جائے اور مظالم کے مقدمات کی سماعت حکمران کے ہاتھ میں ہونے کی بجائے اس محکمہ کے قاضی کے ہاتھ میں ہو۔ یہ اسلوب مؤثر ہونے کے ساتھ ساتھ امت کے لیے بھی اطمینان بخش ہے کیونکہ یہ جانبدارانہ فیصلے کے امکان کو دور کرتا ہے۔ چنانچہ حزب نے اپنے تیار کردہ مسودہ ستور میں یہ طے کیا ہے:

دفعہ نمبر 87: قاضی مظالم وہ قاضی ہوتا ہے جس کا تقرر ریاست کے زیرِ سایہ زندگی گزارنے والے ہر شخص پر ہونے والے ریاستی ظلم کا تدارک کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ خواہ وہ شخص ریاست کی رعایا میں سے ہو یا نہ ہو۔ یہ ظلم خواہ ریاست کے سربراہ کی طرف سے ہو یا اس کے علاوہ کسی اور حاکم یا سرکاری ملازم کی طرف سے۔ محکمہ مظالم کو ریاست کے کسی بھی حاکم یا ملازم کو معزول کرنے کا حق حاصل ہے، جیسا کہ اسے خلیفہ کو معزول کرنے کا حق بھی حاصل ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہے، جب اس ظلم کو دور کرنے کے لیے خلیفہ کو ہٹانا لازمی ہو جائے۔

8) عثمانیوں کا ریاست کے لیے قوانین کی تفصیلی تبنی کرنا

اسلامی ریاست کی مضبوطی کا راز اسلام کے بطورِ آئیڈیالوجی نفاذ میں ہے۔ کیونکہ یہ اسلام ہی ہے جو زندگی کے تمام مسائل کا حل فراہم کرتا ہے اور انسانوں کے امور کو درست طور پر منظم کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے معاملات سے متعلق اسلام کے مآخذ سے قوانین کو اخذ کیا جائے۔ یہ عمل اجتہاد کہلاتا ہے۔ اسلامی ریاست میں خلیفہ ریاست کے امور کو اسلام کے مطابق چلانے کے لیے یا تو خود اجتہاد کر کے قوانین کو اخذ کرتا ہے یا کسی اور مجتہد کے اجتہاد کو نافذ کرتا ہے۔ اسلام کا احسن طریقے سے نفاذ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اجتہاد کو فروغ دیا جائے اور اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ ریاست میں مجتہدین کی وافر تعداد موجود ہو تاکہ ریاست ہر وقت اس قابل ہو کہ وہ نئے جنم لینے والے کسی بھی حکومتی مسئلے کو حل کرنے کے لیے اسلام سے رہنمائی حاصل کر سکے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ کوئی بھی ایسا امر جو اجتہاد کے ماحول کی حوصلہ شکنی کرے وہ مسلمانوں کے فکری جمود اور حکمرانی کی کمزوری کا باعث بنے گا۔

اجتہاد کے فروغ کے لیے بہتر یہ ہے کہ ریاست کے لیے کوئی ایسا ہمہ گیر دستور تیار نہ کیا جائے، جو تمام احکامات پر مشتمل ہو۔ بلکہ ریاست کا دستور ان عام احکامات پر مشتمل ہونا چاہئے، جو ریاست کی شکل وصورت کا تعین کریں اور اس کی وحدت کی بقاء کی ضمانت دیں۔ جبکہ اجتہاد واستنباط کو والیوں اور قاضیوں پر چھوڑ دیا جائے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد اموی وعباسی خلافت تک ایسا ہی تھا۔ خلفاء خود مجتہد ہوا کرتے تھے، انہیں عربی زبان اور اسلامی علوم سے گہری آگاہی حاصل ہوتی تھی۔ یہی حال والیوں اور قاضیوں کا بھی تھا۔ اور خلفاء صرف اُن مخصوص قوانین کی تبنی پر اکتفاء کرتے رہے، جو وحدتِ حکم (حکومت کے ایک ہونے) وحدتِ تشریع (قانون کے ایک ہونے) اور وحدتِ ادارہ (انتظامی امور کے ایک ہونے) کے لیے ناگزیر تھے، اور اس بات سے اجتناب کرتے رہے کہ تمام احکامات کی ہمہ گیر تبنی کرتے ہوئے ایسا دستور نافذ کریں جو تمام تر جزئیات کو طے کرتا ہو۔

تاہم خلافتِ عثمانیہ کے خلفاء جو اگرچہ جنگی مہارت کے لحاظ سے زبردست تھے، مگر انہیں عربی واسلامی علوم سے وہ آگاہی حاصل نہ تھی کہ جو ان سے پہلے آنے والے خلفاء کا خاصا تھی۔ اس وقت مسلمانوں میں اجتہاد کا ماحول مفقود ہو چکا تھا اور تقلید کا رجحان غالب آ چکا تھا۔ نیز عثمانیوں نے ریاستی معاملات کو چلانے کے لیے تفصیلی قوانین پر مبنی دستور کو نافذ کیا، جس میں قوانین کو مغربی دساتیر کی طرز پر شرعی دلائل کو بیان کیے بغیر شق وار ترتیب دیا گیا تھا۔ قوانین کا یہ مجموعہ

مجلہ عثمانیہ کہلاتا تھا۔ جبکہ اس وقت ریاست کے لیے ضروری تھا کہ وہ ریاست میں پھیل جانے والی سنگین فکری کمزوری کا ازالہ کرتی، اجتہاد کی حوصلہ افزائی کرتی اور عربی زبان کو ترویج دیتی اور سرکاری سطح پر بھی عربی زبان کو رائج کرتی، مگر ریاست نے اس سے غفلت برتی۔ چنانچہ خلافت کے والیوں اور عاملوں کی فقہ کی سمجھ مزید کمزور ہوئی اور قاضی بھی صرف ان دستوری قوانین کو سمجھنے پر اکتفا کرنے کی وجہ سے فقہ سے بے بہرہ ہو کر رہ گئے۔ یہ امر ریاستِ خلافت کے زوال میں مزید اضافے کا باعث بنا اور اس کے اثرات جلد ہی ریاست کے کئی پہلوؤں میں ظاہر ہو گئے۔

اس بات کا ادارک کرتے ہوئے ہی حزب نے ریاستِ خلافت کے لیے مسودۂ دستور تیار کیا ہے تاکہ امت خاص طور پر اسلامی مفکرین پر یہ واضح ہو سکے کہ اسلامی دستور میں کن باتوں کو طے کرنا ضروری ہے اور اسے کس طرح ترتیب دیا جانا چاہئے۔ حزب نے دو جلدوں پر مشتمل اپنی کتاب مقدمہ دستور میں ان تفصیلی شرعی دلائل کو بھی بیان کیا ہے کہ جن کی بنا پر اس دستور کو اختیار کیا گیا ہے۔ یہ اپنے طرز کی نہایت منفرد کاوش ہے اور ان سنجیدہ لوگوں کے لیے ایک تحفہ ہے جو ایسی خلافت کے قیام کے خواہشمند ہیں جو نبوت کے نقشِ قدم پر ہو اور ان خامیوں سے پاک ہو جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ریاستِ خلافت میں پیدا ہو گئی تھیں۔ نیز حزب نے اس دستور میں بیان کیا ہے:

دفعہ نمبر 8: عربی زبان ہی چونکہ اسلام کی زبان ہے، اس لیے ریاست صرف عربی زبان استعمال کرے گی۔

اور یہ کہ

دفعہ نمبر 9: اجتہاد فرضِ کفایہ ہے، ہر مسلمان کو اجتہاد کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ اس کے اندر اجتہاد کے لیے درکار شرائط پائی جاتی ہوں۔

9) خلافتِ عثمانیہ کا ریاست میں مغربی قوانین کو رائج کرنا

انیسویں صدی میں مسلمانوں کا فکری انحطاط اپنی انتہاء تک پہنچ چکا تھا۔ اس وقت کے علماء بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ چنانچہ جب مغرب صدیوں کی کوشش کے نتیجے میں ریاستِ خلافت میں اپنے ایجنٹ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا اور انہوں نے مغربی قوانین کو ریاست میں نافذ کرنے کی مہم چلائی تو اس وقت کے علماء ان مغربی قوانین اور اسلام میں تناقض کو محسوس نہ کر پائے اور ان میں خاص طور پر شیخ الاسلام نے ان قوانین کے حق میں فتوے دیے کہ یہ اسلام کے

مخالف نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ فتویٰ بھی جاری کیا گیا کہ جمہوری نظام اسلام سے متناقض نہیں ہے اور یہ کہ اسلام ایک جمہوری دین ہے۔ انہی فتوؤں کی بنا پر خلافت کی عدالتوں میں حدود کو معطل کیا گیا اور مغرب کی سزاؤں کے نظام کو نافذ کیا گیا۔

عثمانی خلافت کے آخری دور میں مغربی دستور و قانون کو اپنانے سے اسلام کی حکمرانی پر کاری ضرب لگی۔ اس نے مسلمانوں کے دلوں میں اسلامی عقیدہ و افکار کو متزلزل کر دیا اور وہ اسلام کے عملی ہونے اور اسلامی نظامِ حکومت کے درست ہونے کے متعلق ہی شک و شبہ میں مبتلا ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں کفار کے لیے دولتِ عثمانیہ کو مٹانا آسان ہو گیا۔ جب کفار ممالک نے مسلمانوں کو قومیتوں میں اور بالخصوص ترک قومیت اور عرب پرستی میں بانٹ دیا، اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے افکار و تصورات اور پیمانوں کو متزلزل کر دیا، اور شرعی احکامات کو جمہوری نظام اور مغربی قوانین سے بدل دیا تو یہ سب کچھ کرنے کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ اب خلافتِ اسلامیہ میں ظاہری نام کے سوا کچھ باقی نہیں پس وہ ریاستِ خلافت کے مکمل خاتمے کی منصوبہ بندی کرنے لگے، بالآخر پہلی جنگِ عظیم کے بعد 1924 میں خلافت کا انہدام ہو گیا۔

آئندہ قائم ہونے والی خلافت کے لیے از حد ضروری ہے کہ وہ صرف اسلام کی آئیڈیالوجی کو اپنائے اور اس کے تصورات، ڈھانچوں، نظام ہائے حیات اور قوانین صرف اور صرف اسلام پر مبنی ہوں اور کوئی غیر اسلامی چیز ان میں داخل نہ ہو۔ آج اسلامی ریاست میں کسی بھی کفریہ تصور یا قانون کو داخل ہونے سے روکنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے دستور میں اس بات کی صراحت سے وضاحت کر دی جائے کہ اسلامی عقیدہ ہی ریاست کے تمام پہلوؤں کی بنیاد ہو گا اور دستور و قانون کو شرعی مآخذ کے علاوہ کسی اور جگہ سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نکتہ اتنا اہم ہے کہ حزب کے تیار کردہ مسودہ دستور کی پہلی شق اسی کے متعلق ہے، پس حزب نے بیان کیا ہے:

اسلامی عقیدہ ہی ریاست کی بنیاد ہے، یعنی ریاست کی ساخت، اس کے ڈھانچے، اس کا محاسبہ یا کوئی بھی ایسی چیز جو ریاست سے متعلق ہو، وہ اسلامی عقیدے ہی کی بنیاد پر استوار ہو گی۔ دستور اور شرعی قوانین کی بنیاد بھی یہی عقیدہ ہے۔ دستور اور قوانین سے متعلق صرف اس چیز کو قبول کیا جائے گا، جو اسلامی عقیدے سے اخذ کردہ ہو۔

نیز

دفعہ نمبر 12: کتاب اللہ، سنتِ رسول ﷺ، اجماعِ صحابہ اور قیاس ہی شرعی احکامات کے لیے معتبر ادلّہ ہیں۔

یہ ہیں وہ وجوہات اور عوامل جو ریاستِ خلافت میں حکمرانی کی کمزوری کا باعث بنے اور انہوں نے خلافت کے انہدام میں اہم کردار ادا کیا۔ یہاں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ جب مسلمانوں کی اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے باعث ریاستِ خلافت کی حکمرانی کمزوری سے دوچار ہوئی تو پھر ایسا کیوں ہے کہ مسلمان مغرب کو خلافت کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے خلافت میں پیدا ہونے والی کمزوریوں کا ازالہ کرنے میں سستی کی ایک وجہ یہ تھی کہ روم و فارس کی فتح کے بعد سے لے کر اٹھارویں صدی عیسوی تک خلافت ہی دنیا میں سپر پاور تھی۔ خلافتِ راشدہ کے بعد کے ادوار میں بھی مسلمان یورپ کے قلب پر حملے کر رہے تھے اور خلافتِ عثمانیہ نے یورپ کو خوف میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس بات نے مسلمانوں کو ان اندرونی کمزوریوں کو دور کرنے سے غافل رکھا جو کہ اندر ہی اندر خلافت کو کھوکھلا کر رہی تھیں۔ یہ درست ہے کہ مسلمانوں نے خلافت میں پیدا ہونے والی کمزوریوں کو بروقت نہیں پہچانا اور انہیں دور کرنے میں سستی برتی تاہم جہاں تک خلافت کے انہدام کے عوامل میں سے سب سے بڑے عامل کا تعلق ہے تو وہ مغرب ہی ہے۔ کیونکہ اگرچہ مسلمانوں کی ریاست کمزور پڑ گئی تھی اور زوال کا شکار ہو گئی تھی مگر قوموں اور ریاستوں کا وقتی طور پر کمزور پڑ جانا ممکن ہے اور اس لحاظ سے یہ کوئی انہونی بات نہ تھی کہ خلافت بھی زوال کا شکار ہوئی۔ مگر اس صورتِ حال کا حل مسلمانوں کی دسترس میں تھا اور مسلمانوں کے لیے زوال سے نکلنا عین ممکن تھا اگر وہ اسلام کے عقیدہ کی طرف رجوع کرتے، اسلام کے افکار میں شامل ہو جانے والی آلائشوں کو دور کرتے، اسلام کو بطورِ آئیڈیالوجی اپنے ذہنوں میں واضح کرتے اور حکمرانی کو ٹھیک ٹھیک بنیادوں پر استوار کرتے۔ مسلمانوں کو پہنچنے والے پے در پے جھٹکوں کی وجہ سے یہ عمل شروع ہو چکا تھا اور مسلمانوں میں بیداری کی لہر پیدا ہو چکی تھی کہ اس موقع پر مغرب نے بھرپور مداخلت کی۔ مغرب نے خلافت کے خلاف فکری، ثقافتی اور سیاسی جنگ کا آغاز کر دیا۔ اس نے اپنے کرپٹ افکار مسلمانوں میں داخل کیے، جو مسلمانوں کے قلوب و اذہان کو اسلامی عقیدہ سے پھوٹنے والے صاف ستھرے افکار سے رہنمائی حاصل کرنے کی راہ میں حائل ہو گئے۔ دوسری طرف یورپ میں برپا ہونے والے فکری انقلاب اور اس کے نتیجے میں صنعتی و سائنسی ترقی نے طاقت کے توازن کو تبدیل کر دیا تھا اور اب یورپ کے لیے ممکن ہو گیا تھا کہ وہ خلافت پر کاری ضرب لگائے۔ چنانچہ پہلی جنگِ عظیم میں خلافت کی شکست کے بعد مغرب نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ریاستِ خلافت کی حکمرانی کی بنیادوں کو ہی تبدیل کر دیا اور ترکی خلافت سے تبدیل ہو کر ایک جمہوری ریاست بن گیا اور ان تمام علاقوں سے دستبردار ہو گیا جنہیں مغرب نے خلافت سے چھینا تھا۔ اس وقت سے مغرب مسلمانوں میں اٹھنے والی نشاۃِ ثانیہ کی ہر لہر کو کچلنے اور اسے غلط

سمت میں موڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پس یہ کہنا غلط نہیں کہ مغرب ہی مسلمانوں کی ریاستِ خلافت کی تباہی کا ذمہ دار ہے اور اس کے دوبارا قائم ہونے سے روکنے کا بھی ذمہ دار ہے۔

مسلمانوں کی خلافت کا رفتہ رفتہ کمزور ہونا اور اس کا انہدام ایک نہایت افسوس ناک اور تکلیف دہ امر تھا تاہم خلافت کی یہ پوری تاریخ ہمارے لیے ایک سبق ہے۔ یہ تاریخ اسلامی ثقافت کا حصہ ہے بالکل اسی طرح جس طرح اسلامی علوم اور عربی زبان اسلامی ثقافت کا حصہ ہیں۔ یہ تاریخ ہمیں اسلام کے نفاذ کی کیفیت سے آگاہ کرتی ہے۔ البتہ اسلامی تاریخ کے مطالعے سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو ایک اسلامی سیاست دان کے طور پر ان واقعات کا جائزہ لیتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو اسلامی طرزِ حکمرانی کا از سر نو آغاز چاہتا ہے وہ خلافت کے اتار اور چڑھاؤ کو محض دلچسپ واقعات اور معلومات کے طور پر نہیں دیکھتا نہ ہی اسے مسلکی تعصب کی سان پر چڑھاتا ہے بلکہ وہ ان واقعات کا جائزہ عملی نقطۂ نظر سے لیتا ہے تاکہ آئندہ قائم ہونے والی خلافت مضبوط بنیادوں پر استوار ہو، اس کی حکمرانی مستحکم ہو اور وہ ان خامیوں سے پاک ہو جو آہستہ آہستہ ریاستِ خلافت کے ڈھانچے اور طرزِ حکمرانی میں سرایت کر گئیں۔ ایک اسلامی سیاست دان جو اگر حکمرانی کی ذمہ داری کو سنبھالے تو ان سیاسی غلطیوں کو نہ دوہرائے جو کہ ماضی میں ہوئیں اور جن کا خمیازہ امتِ مسلمہ کو بھگتنا پڑا۔ اور اگر وہ مجلسِ امت میں ہے تو حکمرانوں کو نصیحت و محاسبہ کرے اور اس چیز کو یقینی بنائے کہ حکمران اسلام سے حاصل ہونے والی مضبوط ترین سمجھ کو ہی نافذ کریں۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خلافت کا زوال اور بالآخر انہدام اس بات کی دلیل ہے کہ ریاستِ خلافت کے ڈھانچے اور حکمرانی کے قوانین میں ردوبدل کیا جانا چاہئے اور اس سلسلے میں انسانی ارتقاء سے حاصل ہونے والے تجربے سے استفادہ حاصل کرنا چاہئے، خاص طور پر مغرب سے کہ جس نے ایک طویل جدوجہد کے بعد بادشاہت سے چھٹکارا حاصل کر کے نئے جمہوری افکار کی بنیاد پر ریاستیں قائم کیں۔ کیونکہ ریاستِ خلافت میں پیدا ہونے والے حکمرانی کے بحران اسلام کے غلط نفاذ اور اسلام کی صاف شفاف تعبیر کو ترک کرنے کا نتیجہ تھے نہ کہ اسلام کو نافذ کرنے کا۔ یہ بات اوپر بیان کردہ تمام تر تفصیل سے واضح ہو جاتی ہے۔

اگر آج کے مغربی ریاستی تصور اور اسلام کے ریاستی ڈھانچے میں کوئی مماثلت ہے تو ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ جمہوریت بادشاہت کے مقابلے میں اسلام کے قریب تر ہے کیونکہ جمہوریت ہو یا بادشاہت یا پھر شخصی آمریت سب اسلام سے ماخوذ نہ ہونے کی وجہ سے کفریہ تصورات ہیں اور اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں اور ان میں سے

کسی کو بھی اپنانا جائز نہیں۔ نہ ہی اس سوچ کا اسلام سے کوئی تعلق ہے کہ اسلام کا کوئی متعین نظامِ حکومت اور ریاستی ڈھانچہ نہیں پس جمہوریت، بادشاہت یا آمریت میں سے کوئی بھی نظام اگر لوگوں کی ضروریات پورا کر رہا ہو اور انہیں عدل و انصاف فراہم کر رہا ہو تو وہ اسلام کے مقصد کو پورا کر رہا ہے۔ کیونکہ جس طرح اسلام نے عبادات، طعام ولباس، تجارت، نکاح و طلاق کے متعلق احکامات دیے ہیں جو شریعت کا حصہ ہیں اسی طرح اسلام نے نظامِ حکمرانی اور ریاستی ڈھانچے کے متعلق بھی احکامات دیے ہیں جو شریعت کا حصہ ہیں۔ اور شریعت کسی بھی انسانی مسئلے کے متعلق خاموش نہیں ہے۔ دینِ اسلام کے مکمل ہونے اور اسلام کے ضابطہ حیات ہونے کا یہی مطلب ہے۔

آج اسلام کے عطا کردہ ریاستی ڈھانچے اور نظامِ حکمرانی میں کسی قسم کے ردوبدل کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ ہی اسلام ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے۔ ہم آج کے فیڈرل طرزِ حکمرانی کی مانند صوبائی خود مختاری کے تصور کو نہیں اپنا سکتے اور نہ ہی صوبوں کے والیوں کے تقرر کا اختیار خلیفہ سے لے کر صوبے کے لوگوں کو منتقل کر سکتے ہیں۔ اور اگر فوج، عدلیہ اور مالیاتی امور آج کے فیڈرل طرزِ حکومت میں بھی مرکز کے ماتحت ہوتے ہیں اور صوبوں کے گورنروں کے کنٹرول میں نہیں ہوتے اور اسلام بھی ہمیں اس بات کی اجازت دیتا ہے تو ہم اختیارات کی اس تقسیم کو اس بنا پر اختیار نہیں کر سکتے کہ فیڈرل طرزِ حکومت اسلام سے ہی ہے بلکہ اسے صرف اس بنا پر اختیار کیا جانا چاہئے کہ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ اسی طرح یہ جائز نہیں کہ اگر ماضی میں بعض اوقات ایسا ہوا کہ خلافت کا منصب کچھ نااہل لوگوں کے ہاتھ میں آگیا تو اس بنا پر یہ سوچ اپنالی جائے کہ جمہوری سیٹ اَپ کی مانند خلافت کے عہدے کی مدت کو چند سالوں تک محدود کر دیا جائے۔ کیونکہ قرآن وسنت نیز اجماعِ صحابہ و قیاس سے ہمیں اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ ہمیں حکمرانی کے مسائل کا حل اسلام کے مآخذ سے ہی تلاش کرنا ہے۔ مثال کے طور پر آج کے دور میں فوجی بغاوت کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنے کے کئی واقعات نظر آتے ہیں، ان فوجی بغاوتوں کے ذریعے ہی امریکہ نے تیسری دنیا میں برطانیہ کے کئی ایجنٹوں کی بجائے اپنے ایجنٹوں کو مسلط کیا۔ اس کا حل اسلام سے یہ نکلتا ہے کہ خلیفہ عملاً فوج کا قائدِ اعلیٰ ہو، فوج کا قائد ہونے کے ناطے وہی چیف آف سٹاف اور ہر بریگیڈ اور ڈویژن کے کمانڈر کا تقرر کرے، جہاد کی براہِ راست نگرانی کرے اور امیر جہاد خلیفہ کی براہِ راست نگرانی اور ماتحتی میں کام کرے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں تھا۔ نیز شعبۂ صنعت، شعبۂ داخلی امن اور شعبۂ بین الاقوامی تعلقات امیر جہاد کی ماتحتی کی بجائے براہِ راست خلیفہ کی نگرانی میں ہوں تاکہ امیر جہاد کے اختیارات حد سے تجاوز نہ کریں اور وہ قوت کا ایک اور مرکز نہ بن سکے۔ نہ کہ ریاستِ خلافت دنیا میں رائج طریقہ کار کی نقالی کرتے ہوئے امیر جہاد کو فوج میں بڑی حد تک خود مختاری عطا کرے اور پھر بغاوتوں کے سدِ باب کے لیے فوجی افسران کے گھروں

کی جاسوسی کا حرام طریقہ اختیار کیا جائے۔ پس آج ہمیں اسی طرزِ فکر کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے جو شروع کے ادوار کے مسلمانوں میں موجود تھی۔ جب مسلمانوں نے نئے علاقوں کو فتح کیا اور حکمرانی کے نت نئے مسائل نے جنم لیا تو مسلمانوں نے ان کے حل کے لیے روم و فارس کی تہذیب، ریاستی فلسفے، دساتیر اور نظم ہائے حیات کی نقالی نہیں کی۔ بلکہ انہوں نے قرآن و سنت کی طرف رجوع کیا اور ان مسائل کے حل کے لیے احکامات کا استنباط کیا۔

آج جب بعض لوگوں کو اسلام غیر عملی دکھائی دیتا ہے یا اسلام اور حقیقت میں ایک فاصلہ محسوس ہوتا ہے تو اس میں قصور اسلام کا نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مغرب کی عینک سے مسائل کو دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہمارے علماء بین الاقوامی صورتِ حال کے درست فہم اور گہری سیاسی بصیرت سے محروم ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے وہ اس بات کا تصور نہیں کر پاتے کہ کس طرح اسلام کو موجودہ صدی میں نافذ کرنا ہے، اسلام کے لحاظ سے حقیقت کو کس طرح تبدیل کرنا ہے اور اس کے لیے کیا کیا اقدام کیے جا سکتے ہیں۔ نتیجتاً ہماری کوششوں کا محور یہ ہو چکا ہے کہ کس طرح موجودہ کرپٹ صورتِ حال کے مطابق اسلام میں پیوند لگایا جائے اور اسلام کے کچھ احکامات سے دستبردار ہوتے ہوئے موجودہ جمہوری نظام میں ہی کسی طرح اسلام کو فٹ کیا جائے۔ اگر ہم خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا احیاء چاہتے ہیں تو ہمیں مغرب کے ریاستی ڈھانچے سے یکسر منہ موڑنا ہو گا اور حکمرانی کے اس تصوراتی فریم ورک سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا ہو گا جو مغرب نے دنیا میں پھیلا رکھا ہے۔ ہمیں قوتِ استنباط اور صلاحیتِ اجتہاد کو دوبارا پیدا کرنا ہو گا تاکہ آج کے دور میں کسی بھی پیدا ہونے والے نئے ریاستی مسئلے کے لیے شرعی مآخذ سے ٹھیک ٹھیک احکامات اخذ کیے جا سکیں۔ تبھی آئندہ قائم ہونے والی خلافت ماضی کی کمزوریوں سے محفوظ رہ سکے گی۔